ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

تجدید و احیاء

(۲)

مسلم تمدن نے اپنے دورِ اقبال و کامرانی میں گذشتہ تہذیبوں کے بہترین عناصر اور اچھائیوں کو اپنے میں سمو لیا۔ ہندوؤں کی روحانیت، عبرانیوں کی اخلاقی خدا پرستی، معہ اس کے معراج کمال کے جو مسیح کے روح ہونے پر منتہی ہوئی اور جسے قرآن روح اللہ سے تعبیر کرتا ہے، اور رومنوں کی قانونی ذہانت کو اپنا لیا۔ ازمنۂ گذشتہ کی متعدد خداداد صلاحیتوں کی حامل قوموں کی خدمات کو مومن کی فراست نے اپنی آغوش تربیت میں لے لیا۔ قرآن نے نسل انسانی کی یگانگت اور خدا کی وحدانیت کے ساتھ وحدت ادیان پر زور دیا۔ اسلام نے مجرد فلسفیانہ وحدت کی تعلیم نہیں دی جس نے ہندو ویدانتیوں اور فلاطونیوں کو ایک بے صفت ذات مطلق کے فرض کرنے میں گمراہ کر دیا تھا۔ اسلام کی وحدانیت ایک وحدت در کثرت اور یک رنگی در بوقلمونی تھی۔ اسلام کا خدا ظہور و نمود بھی ہے اور حقیقت و واقعیت بھی۔ وہ بیک وقت مجرد بھی ہے اور محسوس و موجود بھی۔ تمام موجودات ایک سالم کل کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں مجرد وحدت وجود اور مجرد کثرت وجود، دونوں محض تجریدات ذہنی کی طرح متصور ہوتے ہیں۔ قدیم اصطلاح میں مذہب، تمدن و تہذیب کے تمام دائرہ عمل پر حاوی تھا۔ اس لئے قرآن جب وحدت ادیان پر زور دیتا ہے اور اس کو ایمان و یقین کا مرکزی اصول قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب تمام انسانی تہذیبوں کی اساسی وحدت ہوتا ہے۔ اسلام نے اس امر کی تعلیم دی کہ روحانیت اور نجات کسی گروہ یا جماعت کی اجارہ داری نہیں ہے، جو بلا شرکت غیرے اپنے لئے اس کی دعویدار ہو۔ اس نے یہودیوں کے چنیدہ قوم ہونے کے تصور کو رد کر دیا، جو خود کو خدا کے خاص فضل و عنایت کا مستحق سمجھتے تھے اور اپنے لئے توفق و برتری کے امتیازی حق کو بہر حال باقی رکھنا چاہتے تھے۔ قرآن نے یہ تعلیم دی کہ کوئی گروہ یا جماعت ہمیشہ کے لئے حق یافتہ نہیں ہے۔ ہر ایک ملت نیک و بد افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ نیکی ہی ہے کہ جب اس کا پلہ کسی جماعت میں بھاری ہوتا ہے تو اس کو برتری اور قیادت کا حق عطا کرتی ہے۔ بصورت دیگر ہر قسم کی نجات، انفرادی نجات کا حکم رکھتی ہے۔ از روئے مذہب کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

بلیٰ من اسلم وجهه للّٰه وھو محسن فله اجره عند ربه (البقرہ – ۱۰۶)
ہاں! جس کسی نے خدا کے آگے سرنیاز جھکا دیا اور نیک عمل بھی ہوا، تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر پائیگا۔

دین ایک فطری قانون الٰہی ہے۔ جب کوئی قوم اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ترک کر دیتی ہے، جو انسان کی روحانی فطرت کا قانون ہے، تو تہذیب و تمدن کی شمع روشن رکھنے کے لئے یہ خدمت ان لوگوں کو تفویض کر دی جاتی ہے جو اپنی صلاحیت کا ثبوت اعلیٰ بصیرت اور برتر حیات سے دیتے ہیں۔ اس طرح جماعتی تفوق و برتری ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔

تاریخ انسانیت میں مختلف قومیں، مختلف زمانوں میں، اپنی گوناگوں خدمات سے انسانی تہذیب و شائستگی کے سرمایہ میں اضافہ کرتی رہیں، لیکن اعلیٰ ترین تہذیبیں ترک و انقطاع سے نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ اخذ و اختیار کے ذریعہ پروان چڑھی ہیں، اور ترقی پذیر حیات کی کیمیاگری سے ان کی ماہیت تبدیل ہوتی رہی ہے۔ خذ ما صفا و دع ما کدر ایک عام اسلامی اصول ہے۔ اسلام نے عبرانیت کی وہ تمام چیزیں برقرار رکھیں جو اخلاقی و روحانی زندگی کو سہارا دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں، لیکن عبرانیوں کی تنگ نظری اور سخت گیری ترک کر دی گئی۔ اسی طرح اسلام نے بے لوث عیسائیت کے ہمیشہ قائم رہنے والے قابل قدر عناصر کو برقرار رکھا، لیکن اس کی حد سے متجاوز رہبانیت اور آخرت پرستی کو رد کر دیا۔ اسی طرح مسلمان یونانیوں کے ذہنی کارناموں کے بھی وارث بنے، انہیں پروان چڑھایا اور آخر میں اپنا یہ سارا سرمایہ مغرب کو عطا کر دیا۔ جب ہم اسلام کی ابتدائی چھ صدیوں کی تہذیبی ثقافتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کی غیر معمولی ذہانت نے تمام تہذیبوں کے بہترین عناصر کو باہم آمیز کیا اور اس امتزاج کو ایک تخلیقی صورت عطا کی۔

صدیوں کی غفلت و جمود کے بعد اب مسلمانوں کو اس تخلیقی جذب و انجذاب کی روح کو دوبارہ تسخیر کرنا ہے۔ گذشتہ تین صدیوں کے دوران میں جبکہ غفلت کی نیند سو رہے تھے، مغرب مسلسل اور باقاعدہ طور پر مادی، اجتماعی، سیاسی اور ذہنی ترقی کرتا رہا۔ مسلمان جذبۂ عمل کو دوسروں کے سپرد کر کے خود بے نیاز حرکت و عمل ہو گئے۔ نشاۃ جدیدہ، دور اصلاح و تجدید، صنعتی انقلاب، فرانسیسی انقلاب اور حالیہ اشتراکی یا اشتمالی عظیم معاشرتی تغیرات نے سارے یورپ میں ایک ہیجان برپا کر دیا جس سے زندگی کے نئے تصورات اور جدید سانچے وجود میں آئے۔ مسلمان بھی ان کے محض تماشائی نہ رہ سکے۔ یہ تمام تحریکات ان کے قریب سے ہو کر گذریں اور بالآخر انھیں جا لیا اور ہر چہار طرف سے انہیں گھیر کر سیاسی اور معاشی حیثیت سے اپنا دست نگر بنا لیا۔ ان تحریکات سے جو اثرات پھیلے وہ اس قدر قوی تھے کہ شدید نقصان اٹھائے بغیر انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ میں نے اس سے قبل کہا ہے کہ اسلام نے عروج و ترقی، تقلید یا انتخابیت سے نہیں بلکہ تخلیقی اخذ و اختراع سے حاصل کی تھی، مسلمان

اپنی اس سابقہ روش کو اختیار کرکے پھر سے ایک نئی زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کہنا بالکل عبث ہے کہ مغرب نے صرف مادی ترقی کی ہے۔ زندگی ایک سالم کل ہے اور کسی خلا میں مادی ترقی کا حصول محال ہے، اور نہ یہ ترقی حیات کے دیگر پہلوؤں سے کنارہ کش رہ سکتی ہے۔ مادہ وروح ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔ سائنس اور صنعتی علوم انسان کی درجہ بدرجہ آزادی کے ذریعے فروغ پاتے ہیں، اور ان میں انسانی زندگی کو اس طرح بدل ڈالنے کی صلاحیت ہے کہ وہ پہچانی بھی نہ جاسکے۔ یہ علوم عمدہ اصول حفظان صحت، بہتر تندرستی، اعلیٰ معیار زندگی، وسیع عام تعلیم اور انسان کے لئے ہمہ جہتی ترقی و استکمال نفس کے مواقع بہم پہنچا سکتے ہیں۔ زندگی کی عظیم طاقتوں کی طرح ان کا بھی غلط استعمال کیا جاسکتا ہے، اور ان کا غلط استعمال امن و جنگ دونوں حالتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ بجائے تخریبی کاموں کے انہیں تعمیری کاموں میں لگائے۔ اس وقت مسلمانوں کو دوسروں سے بہت کچھ سیکھنا، اور ان سے بہتر طریق پر استفادہ کرنا ہے۔ صنعتی اعتبار سے پس ماندہ علاقوں کا مزدور پیشہ اور محکوم بن جانا اور جن قوموں کو علم نے قوت عطا کی ہے ان کی ادنیٰ خدمات انجام دینا، ایک لابدی امر ہے۔

ابتدائی اسلام نے سیاسی و معاشری میدان عمل میں یورپ کو جمہوریت کا اعلیٰ تصور عطا کیا جس میں سلاطین، امراء اور حقوق یافتہ طبقات کی کوئی مسلمہ حیثیت نہ تھی، اور مغرب کو معاشی زندگی میں ایسی تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کیا جو قومی دولت کی گردش کو معدودے چند مالداروں میں محدود ہونے سے روک دیں۔ اہل مغرب نے اس نصب العین تک رسائی حاصل کرنے کی جہد وسعی کی، اور اس کو دستوری ترمیموں کے ذریعہ روبہ عمل لانے کے وسائل و ذرائع سوچتے رہے۔ حریت واخوت اور مساوات کا نعرۂ انقلاب فرانس سے بہت پہلے اصلاً مذہب اسلام کا ایک جزو رہا ہے۔ زائد دولت پر محصول عاید کرنا اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک ہے، مگر موجودہ اشتراکیت نے اس خدمت کو کسی اسلامی ملک سے زیادہ بہتر طریقہ پر انجام دیا ہے۔ معاشی طبقات کو تسلیم نہ کرنا بھی اسلامی نمونہ کی زندگی کا ایک تکمیلی جزو تھا۔ حضرت ابوذرؓ معاشی اور معاشری مساوات پسند افراد سے اس معاملہ میں ایک ہزار سالہ سبقت رکھتے ہیں۔ اس زمانہ میں بھی سرمایہ داروں نے ان کی مزاحمت کی اور حکومت کو ان پر نگرانی رکھنے کی طرف توجہ دلائی، لیکن یہ برابر ان کے خلاف احتجاج کرتے اور یہ حجت پیش کرتے رہے کہ قرآن وسنت کی تعلیم ایسی ہی ہے۔ مغرب میں نسلی اور قومی امتیازات پر زور دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہٹلر اور سولینی کا ظہور ہوا۔ چنانچہ اس اعتبار سے تو شمالی امریکیوں اور برطانوی دولت مشترکہ سے بہتر ثابت ہوئے۔ لیکن مسلمان سیاسی عمومیت کھو کر بھی معاشری عمومیت پر عمل پیرا رہے۔ مسلمان کسی قسم کے بھی رنگ ونسل کے امتیازات کو تسلیم نہیں کرتے۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ تم اپنے میں سے بہترین آدمی کا بطور اپنے قائد کے انتخاب کرو۔ اور اس کی فرمانبرداری کرو۔ خواہ وہ ایک حبشی نژاد ہی کیوں نہ ہو۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جبکہ اس امر کا اندیشہ تھا کہ عرب قومی و نسلی فخر وغرور کے نشہ

میں چور ہو جائیں گے، آپ نے آخری خطبہ میں یہ اعلان فرمایا کہ عرب کو غیر عرب پر کوئی حقیقی تفوق حاصل نہیں ہے، اور نہ غیر عرب کسی عرب پر ذاتی برتری رکھتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر خدا کو گواہ ٹھہرایا اور یہ فرمایا کہ تمام بنی نوع انسان مثل ایک خاندان کے ہیں اور کسی فرد کو بزرگی و برتری صرف اعلیٰ کردار سے حاصل ہوتی ہے۔ اسلام بجز اس کے کسی دوسرے معیار کو تسلیم نہیں کرتا۔ مشہور برطانوی مورخ ٹائن بی کہتا ہے کہ اسلام کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ کسی دوسری تہذیب سے زیادہ اسلام نے اصول انسانیت پر عمل کیا۔ نسل انسانی کے حال و استقبال کے لئے یہ سب سے زیادہ اہم کام ہے۔ یورپ کی حکومتیں لاتعداد افریقیوں کو کچل رہی ہیں اور ابتدائی حقوق اور شہری آزادیاں دینے سے انکار کر رہی ہیں۔ جنوبی افریقہ کی یونین دولت مشترکہ کا ایک جزو ہے جس کا دنیا کے سامنے یہ اعلان ہے کہ وہ جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کی پشت پناہ ہے، لیکن اس کے باوجود جنوبی افریقہ ایک قسم کی فاشستی مملکت ہے۔ فرانسیسیوں نے انقلاب فرانس کے نعروں کو فراموش کر دیا، اور معاشی انتفاع کے پیش نظر شمالی افریقہ اور انڈوچائنا کو اپنے زیر تصرف رکھنے کی جد و جہد کرتے رہے۔ جب مسلمان بیدار ہو کر دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے تو ان تمام ریاکاریوں کا خاتمہ کر دیں گے، کیونکہ یہ اسلام کی روح کے منافی ہیں۔ مسلمانوں کو مغربی جمہوریتوں کے اصول فن کچھ نہ کچھ سیکھنے پڑیں گے، لیکن وہ پوری طرح ان کی تائید نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ انہیں غلامانہ تقلید کی حاجت نہیں، بلکہ انتخاب میں بڑی احتیاط اور ذوق سلیم سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ وہ قومیں جو عروج و ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں، جب وہ بیدار ہوتی ہیں تو کئی باتوں میں سخت رکاوٹوں سے دوچار ہوتی ہیں، مگر ایک لحاظ سے وہ فائدہ میں بھی رہتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس سے کما حقہٗ استفادہ کریں۔ ترقی یافتہ قومیں اب تک مختلف طریقوں کو آزما چکی ہیں اور اس تجربہ و آزمائش کی راہ میں ہر قدم جو اٹھایا گیا ہے اس کا نفع و نقصان واضح ہو چکا ہے۔ انھوں نے جس طرح اپنی دشواریوں کو حل کیا اور نئے مسائل سے دوچار ہوئے وہ ان لوگوں کے لئے جو بعد میں ان راہوں پر گامزن ہونا چاہتے ہیں، ہدایت و انتباہ دونوں کا کام دیتے ہیں۔

تاریخ ایک فلسفہ ہے جس میں مثالوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ کائنات میں کوئی چیز اپنے آپ کو بعینہٖ نہیں دُہراتی اور تاریخ انسانیت کے واقعات میں تو ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ لیکن تمام علوم علاقہ علت و معلول کی مماثلتوں پر مبنی ہیں۔ فطرت انسانی اور اس کی حالتوں میں چند بنیادی یکرنگیاں ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس نے ماضی سے سبق حاصل کرنے اور دوسروں کے تجربات سے مستفید ہونے کو ممکن بنا دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیسویں صدی ایک عالم گیر بیداری کی صدی ہے۔ دو عالمی جنگوں نے انسانی اداروں کو بیخ و بنیاد سے ہلا دیا ہے۔ یہ جنگیں محض فوجی اور معاشی آویزشیں نہیں تھیں، بلکہ یہ نظاماتِ فکر کی باہمی پیکار تھی۔ تصوّرات جن کے لئے ایک قوم مصیبت جھیلتی اور جان پر کھیلتی ہے، جب ناقابلِ مقاومت طاقت بن جاتے

ہیں۔ تو ان کی غیر خون ریز علمی نظریات کی صورت باقی نہیں رہتی۔ اگر مسلمان ٹھنڈے دل سے اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کے اسباب و علل کا جائزہ لیں تو وہ بہت کچھ اپنے گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بلا دِ یورپ کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کئے بغیر نہ موجودہ دنیا کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو اس کے مطابق کر سکتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کو مغربی تاریخ کا ایک حصّہ کہا جا سکتا ہے۔ ان میں ہمیشہ باہمی تاثیر و تاثر، تعامل و تفاعل اور ردعمل کارفرما رہا۔ یہ دور کئی صدیوں پر محیط ہے، جو عربی اسلامی قوت کی پہلی ضرب سے شروع ہوتا اور مسلمانانِ اندلس کے شاندار دور، غیر مقدس صلیبی جنگوں، اور ترکوں کے ہاتھوں بحرِ روم کے مشرقی کی فتح و تسخیر سے گذرتا ہوا مغربی قوتوں کے اُبھرنے اور بلاواسطہ و بالواسطہ عالمِ اسلامی کے ایک بڑے حصّہ کو مطیع و منقاد کرنے پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح مغرب اور دُنیائے اسلام کی تاریخ ایک دوسرے سے وابستہ رہی ہے۔ بھلائی یا بُرائی کے لئے ان کا ایک دوسرے سے تصادم و تصارف عظیم نتائج کا حامل رہا ہے۔ دو ہولناک خونیں جنگوں کے دوران میں اور موجود اعصابی جنگ میں، مسلمان غیر جانب دار نہ رہ سکے اور طوعاً و کرہاً انہیں فریقین میں سے کسی ایک کی طرفداری کرنی پڑی۔

موجودہ حالت میں مسلم ممالک و اقوام کے پاس بہت کم ایسی چیزیں باقی ہیں جنہیں تہذیبی نمونوں کی صورت میں دوسروں کو پیش کیا جا سکے۔ ان کے پاس صرف نصب العین رہ گئے ہیں، لیکن وہ بھی صدیوں کے مخالف اثرات کے سبب مبہم اور خلط ملط ہو چکے ہیں۔ بعض ممالک ہنوز سیاسی آزادی کے لئے سرگرمِ عمل ہیں اور موجودہ حالت میں ان کا اوّلیں مقصد بیرونی اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ دوسرے ممالک ایسے ہیں جو اگرچہ سیاسی طور پر آزاد ہیں، تاہم وہ اب تک زبردست فوجی، سیاسی اور خارجی دباؤ کے زیر اثر ہیں۔ ان میں سے اکثر داخلی معاملات میں صعوبتوں اور سختیوں کا شکار ہیں، جو ایک نئی زندگی کے وجود میں آنے کے وقت پیش آتی ہیں۔ اسلام ایک سادہ اور عقلی مذہب ہے، جو خدا پرستی اور ہمہ خیر پروردگاری پر مبنی ہے۔ یہ زندگی کے کل اطراف کی مکمل اور ہم آہنگ نشوونما ارتقاء کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ ابدی اقدار کبھی نہیں بدلتے اور طبعی اور انسانی فطرت کے قوانین بھی غیر تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ لیکن تمام بڑے مذاہب نے اپنے مرکزہ کے گرد بہت سے قوانین، رسوم اور معمولات جمع کر لئے ہیں اس لئے ان کی اصل روح، روایات کے انبار میں مفقود ہو گئی ہے۔ قدامت، قانون و آئین کو تقدس کا درجہ عطا کرتی ہے، اور ہر چیز جس پر مذہب کی مہر لگ جاتی ہے وہ واجب التعظیم بن کر ہر قسم کی اصلاح و ترقی کا مقابلہ کرتی ہے۔ ملوکیت کا ادارہ ایک غیر اسلامی ادارہ ہے۔ موروثی حکومت عین اساس اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن ہم اب تک بادشاہوں کو تقریباً مطلق العنان اختیارات کے ساتھ لوگوں پر حکمران پاتے ہیں، اور عوام ان کو اس لئے برداشت کرتے ہیں کہ کوئی قابلِ عمل متبادل صورت آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ بایں ہمہ اسلامی جمہوریت کی روح، جہاں کہیں اس کو موقع ملتا ہے، اپنا ظہور کرتی ہے۔ مصر نے اپنے نااہل بادشاہ کو نکال باہر کیا اور ایران بھی شاہی

کو برخاست کرنے کی فکر میں ہے۔ اگر وہاں بادشاہ رہے گا بھی تو اس کی حیثیت دستوری حکمران کی ہوگی۔ عربستان جو اسلام کا گہوارہ ہے، بدقسمتی سے اس کی حالت ایسی ہے کہ وہاں مختصر و منتشر خانہ بدوش آبادی کے سبب جدید طرز کی جمہوریت کے لوازم کو فروغ دینا دشوار ہے، لیکن اپنے وقت پر یہاں بھی انقلاب کا ہونا ضروری ہے۔

بہت سے اسلامی ممالک ماقبل صنعت، زرعی تمدّن کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اس لئے یہاں جس خاص اصلاح کی ضرورت ہے وہ تنظیم دیہی کی از سرِ نو تعمیر ہے۔ ایسے علاقوں میں زمینداری عملاً جاگیری نوعیت کی ہے، تاہم اصولاً اس کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ آبادی کی اکثریت مزارعین پر مشتمل ہے، جو بدقّت تمام اپنا پیٹ بھر کر زندگی بسر کر رہے ہیں، اور جو زمینداری کے ہاتھوں لوٹے اور قدرت کی طرف سے ڈرائے جا رہے ہیں۔ کسانوں کی حالت کو سدھارنے اور بہتر بنانے کی شدید ضرورت ہے۔ چونکہ حصول معیشت کی کوئی دوسری راہ نہیں ہے اس لئے آبادی کا زیادہ دباؤ زمینوں کی طرف ہے۔ زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے لئے حق ملکیّتِ زمین کو سختی کے ساتھ دوبارہ جانچنے کی ضرورت ہے۔ بڑی گرما گرم بحثیں جاری ہیں کہ مسئلہ زمین کی بابت اسلام کیا رہنمائی کرتا ہے۔ ترقی پسند مفکرین اور معاشری مصلحین یہ نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم زمین کو بنی نوع انسان کی مشترکہ ملکیت قرار دینا چاہتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ زمین اللہ کی ملکیت ہے، اور اسلامی فقہ میں اللہ کا لفظ عام رفاہیت و بہبودی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا حکومت، حقِ ملکیت زمین کا اس طرح بندوبست کرے کہ زمین کی منصفانہ تقسیم کے ساتھ اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکے۔ اسلام کا قانونِ وراثت کسی ایک فرد کے پاس کثیر املاک نہیں چھوڑتا، اور زمین بالآخر ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے کہ جس سے نفع بخش کاشت موقوف ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کے پاس ایک ایکڑ زمین بھی ہوتی ہے تو وہ مختلف مقامات پر منتشر رہتی ہے۔ عموماً بڑے زمیندار غائب باش مالکانِ اراضی ہوتے ہیں، جنہیں صرف کاشتکار کی محنت اور گاڑھی کمائی سے نفع اٹھانے سے سروکار رہتا ہے۔ زمین کو بہتر بنانے اور ترقی دینے سے ان کو بہت کم دلچسپی ہوتی ہے، لیکن ترقی کے ثمرات کا بڑا حصّہ زمیندار کے بنک فاضلات یا تعیشات کے مدات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ تلخ و تند مباحثہ اس بات پر جاری ہے کہ حقِ ملکیت زمین کی بابت پیغمبرِ اسلامؐ کا منشاء کیا تھا، اور آپ کے زبردست اور قابل جانشین حضرت عمرؓ نے اس خصوص میں کیا عمل فرمایا۔ جب عربوں نے زرخیز علاقوں کو فتح کیا تو انہوں نے خلیفہ سے اس کا مطالبہ کیا کہ مفتوحہ علاقے جاگیروں میں تقسیم کر کے فاتحین کو عطا کئے جائیں۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے حضرت عمرؓ نے مجلسِ شوریٰ طلب فرمائی۔ آپ کا یہ نظریہ تھا کہ اگر کاشتکار کو مثل زرعی غلاموں کے مالکان اراضی کے تحت دے دیا جائے تو یہ غیر دانشمندانہ اور غیر اسلامی عمل ہوگا۔ حریص اور خود غرض لوگوں کی زبردست مخالفت پر غالب آنے کے بعد آپ نے انہیں

اس بات پر قائل کر دیا کہ مفتوحہ اراضی کو خانگی جائداد میں تقسیم کرنا بڑی غلطی و زیادتی ہو گی اور آپ کا آخری فیصلہ جس سے دوسروں نے بھی اتفاق کیا، یہ تھا کہ تمام مفتوحہ علاقہ قومی ملکیت قرار پائے۔ ایران، شام، عراق اور مصر کی جاگیریں جو گذشتہ دور میں ان علاقوں کے امراء کی ملکیت میں تھیں ضبط کر لی گئیں، لیکن زمینیں اصل کاشتکاروں کے قبضہ میں چھوڑ دی گئیں جو حکومت کی مقرر کردہ نہایت معمولی شرح لگان ادا کرتے تھے۔ آپ نے اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا کہ مسلمانوں کو ان علاقوں میں اراضی خریدنے کی ممانعت فرمادی۔ مسلمان زمینداران نظائر کا حوالہ دیتے ہیں، جہاں آنحضرتؐ نے ان لوگوں کو اس امر کی اجازت عطا فرمائی تھی کہ وہ زمین کو اپنی ملکیت میں رکھکر کاشتکار سے بٹائی پر نقد یا جنس کی صورت میں معاہدہ کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ آنحضرتؐ نے بٹائی کے طریقہ کو جائز رکھا مگر یہ بھی لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ یہ بہتر ہو گا کہ کوئی شخص اسی حد تک زمین اپنے پاس رکھے جس حد تک کہ وہ خود کاشت کر سکتا ہے اور باقی کو بلا کسی معاوضہ کے دوسروں کو کاشت کرنے کے لئے حوالے کر دے۔ یہ چیز اسلامی تعلیمات کے عین موافق ہو گی کہ زمین مثل پانی اور ہوا کے سب کو مفت میسر آئے اور صرف پیداآوری اور باہمی حق و انصاف کے قیود کی تابع رہے۔ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ غیر مزروعہ اراضی پر قبضہ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب مسلم علاقے کا شتکار اور عوام کے نفع کی خاطر حقِ ملکیت زمین پر نظر ثانی کریں گے تو یہ معاشری عدل اور معاشی اصلاح کی طرف ایک زبردست قدم ہو گا۔ غائب باش مالکانِ اراضی، جو بڑی بڑی جائدادوں پر متصرف ہیں، رجعت پسند مولویوں سے اس امر کے ثبوت میں اعانت چاہ رہے ہیں کہ دوسری املاک کی طرح اراضی کے غیر محدود قبضہ کو از روئے اسلام جائز قرار دیں۔ اس قسم کے زمینداروں اور ایسے مولویوں کی یہ ناپاک ملی بھگت ایسے حالات پیدا کرنے کا موجب ہو گی جس کی انتہا ایک شدید انقلاب کی صورت اختیار کریگی۔ جنرل نجیب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مصر نے اس مسئلہ کے حل کرنے میں بہت کچھ کامیابی حاصل کر لی۔ شاہِ ایران نے تالیف قلوب کی خاطر متعدد لگان داروں کو اپنے صرفِ خاص کی زمینوں پر مالکانہ حق عطا کیا ہے۔ زمانہ کے آثار یہ بتلا رہے ہیں کہ شاہی کے بعد اب منفعت پیشہ غائب باش زمینداریت کا خاتمہ بھی قریب ہے۔ بڑے زمیندار اپنی املاک کے معاوضوں کا مطالبہ کر رہے ہیں، جو تفصیل سے جانچے جانے پر مشتبہ الاصل ثابت ہوتی ہیں۔ یہ زیادہ تر لوٹی کھسوٹی ہوئی جائدادیں ہیں اور کسی بڑے زمیندار نے عرق ریزی یا راست معاملگی سے انہیں حاصل نہیں کیا ہے۔

پاکستان میں کسانوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے چند تدابیر اختیار کی گئی ہیں، لیکن پاکستان کے زعمائے ملّت، اہلِ سیاست اور اصحابِ حکومت کا ایک کثیر حصّہ چونکہ بڑے زمینداروں پر مشتمل ہے، اس لئے بادلِ ناخواستہ اور ہچکچاتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ بعض اہلِ ہمّت جو پاکستان کے معمار ہیں

اور جن کے ہاتھوں میں عنانِ اقتدار ہے، اس مملکت میں عدل معاشری کے معیار کو بلند کرنے کے مخلصانہ آرزومند ہیں اور اپنے اثرات کے ذریعہ خلوصِ دل سے اس کے لئے کوشاں ہیں، لیکن انہیں ایک قدیم مستحکم نظام کے جمود کو توڑنا اور ذی اثر مستقل مفادات رکھنے والوں کی مقاومت پر غالب آنا ہے۔ عوام کی فلاح و بہبود سے کافی حد تک نظریاتی اور تصوراتی دلچسپی لی جاتی ہے۔ ایک عام حرکت رونما ہو چکی ہے، مگر طریق کار کی سُست رفتاری نے غریب طبقوں کو مضطرب و بے چین بنا رکھا ہے۔

اسلامی اصول قانون میں کسی اور حریّت پسند مگر عملی رجحان رکھنے والی سوسائٹی کے قانون کی طرح حقوق بلا قید و غیر مشروط نہیں ہیں۔ حقوق، فرائض اور فرائض حقوق سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی فرد کا حق اپنے استعمال سے عام فلاح و بہبود کے قانون کے خلاف جائے تو فرد کا مفاد عام مفاد کی خاطر قربان کر دینا چاہیئے۔ غالب زمینداری والے کاشت کاری کے طریقے اور حق ملکیت زمین کے اصول خود اپنے طور پر درست ہونے کے لئے چھوڑے نہیں جا سکتے۔ اصول عدم مداخلت تجارت اور صنعت و حرفت میں منظم و منضبط اجتماعی تنظیم کے لئے بتدریج جگہ خالی کر رہا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ زراعت کو جو کثیر و لاتعداد آبادی کا اصل ذریعہ معاش ہے قدیم روایات اور طریقوں پر چھوڑ دیا جائے۔ اسلام نے ملکیت زمین کے کسی مخصوص نظام کی اشاعت نہیں کی۔ مختلف مقامات اور جداگانہ حالات کے تحت طرح طرح کے نظامات عمل میں لائے اور روا رکھے گئے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مختلف زرعی نظامات کو عام فلاح و بہبود اور عدل معاشری کے مطابق نئی تشکیل دینا ضروری ہے۔

دنیا میں مشکل سے کوئی ملک ایسا ہوگا جو اشتمالیت کے تصادم و تصارف سے راست یا بالواسطہ متاثر نہ ہوا ہو۔ ایشیائی ممالک میں عام باشندگانِ ملک اشتمالیت کے فلسفہ اور مسلک کی بابت نہ کچھ جانتے ہیں اور نہ انہیں اس کی کوئی فکر ہے۔ اگر وہ روس کی کلیت پسندی کا پورا نقشہ اپنے ذہن میں قائم کریں تو یقیناً اس کے بہت سے تصورات اور طریقوں سے کانپ اُٹھیں گے۔ عام طور پر مسلمان عوام اور روشن خیال طبقہ سوا چند منتشر لادینوں اور دھریوں کے سب اسلام پر کامل ایمان رکھنے والے ہیں۔ ان میں سے بعض روایات پرست، اصول پرست اور قدامت پرست ہیں، جن کے نزدیک دائمی سانچے اور نمونے کسی بعید ماضی میں بن چکے ہیں اور بعض آزاد خیال خدا پرست ہیں، جو اسلام میں ایک خاطر خواہ تصوّرِ زندگی پاتے ہیں اور اس کی جدید تفسیر و تعبیر کے آرزومند ہیں جس کو وہ روحِ اسلام کے منافی نہیں سمجھتے۔ ان میں سے کوئی ملحد اور مادہ پرست نہیں ہے۔ اور ان کے لئے مارکسیت کوئی نظریاتی یا جذباتی دلکشی نہیں رکھتی۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ روس نے، جو غالب حیثیت سے ایک جاگیرداری اور زرعی ملک تھا، تھوڑے عرصہ میں منصوبہ بند اجتماعی تنظیم کے ذریعہ ترقی حاصل کی، پیداوار میں اضافہ ہوا اور وہاں کسان اچھا خاصہ معاوضہ پا رہا ہے، تو وہ اس کی طرف جھک پڑتے ہیں۔ روس نے اجتماعی کاشتکاری، نظامِ زمینداری کی مسدود

اور چھوٹی چھوٹی پٹہ داریوں کی خرابیوں کے خاتمے سے اپنی زراعت کو ترقی دی ہے۔ ایک عام آدمی یہ یقین کرنے پر مجبور ہے کہ یہ طریق اس قدیم نظام سے کہیں بہتر ہے جو چند تباہ کار لوگوں کے سوا کسی کو فائدہ نہیں پہنچاتا۔ شہروں میں مزدور ہر وقت یہ سنتے رہتے ہیں کہ روس میں بے روزگاری نہیں ہے، تعلیم اور طبی امداد مفت اور عام ہے، اور غذا اور لباس و مکان کا معیار اگرچہ انگلستان یا امریکہ کے مقابلہ میں ادنیٰ ہے، مگر ایشیا میں ایک عام آدمی کے لئے تشفی بخش اور قابلِ اطمینان ہے، تو وہ کمیونزم کی طرف نظریں دوڑاتا ہے اور اس کو تمام دکھوں کا مداوا سمجھنے لگتا ہے۔ کمیونزم جو غریب ملکوں کو اپنا شیدائی بناتا ہے، وہ ایسا کمیونزم ہے جس کی دلربائی محض افلاس وفاقہ کی پیدا کردہ ہے۔ اشتمالی چین نے روزانہ ایک پیالہ اناج ہر باشندۂ ملک کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔ فاشیت نے بھی بالکل اسی طرح پر اطالویوں کی ایک کثیر تعداد کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مسولینی سے قبل وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں روٹی کہاں سے ملے گی اور یہ کہ آیا انہیں روٹی ملے گی بھی یا نہیں۔ لیکن فاشیت کے بعد وہ اس خصوص میں خود کو بے خطر محسوس کرنے لگے۔ امریکہ اپنی غیر معمولی صنعتی ترقی، زبردست قدرتی ذرائع، اور ہند و چین کے مقابلے میں محدود آبادی کے سبب اپنے مزدوروں کو رئیسانہ اور شاندار اُجرتیں ادا کر سکتا ہے۔ یہاں ایک نجار یا معمار کی ایک گھنٹہ کی اُجرت بہت سے دیگر ملکوں کی دو یا تین دن کی مزدوری سے زائد ہوتی ہے۔ بڑے سرمایہ داروں کی مٹھی بھر جماعت کے پاس بے حد و شمار دولت بنکوں میں جمع ہو سکتی ہے، مگر یہ چیز ایک عام آدمی کے معیارِ زندگی کو علی الرغم متاثر کرتی معلوم نہیں ہوتی، جس کے پاس خود اپنا برقی چولہا، ریفری جیریٹر اور ٹیلی ویژن سٹ ہوتا ہے اور بالعموم ایک مستعمل موٹر بھی سواری کے لئے رہتی ہے۔ برطانوی مزدور بھی جو بیک وقت انفرادی اور اشتراکی دونوں ہوتا ہے روس کی مثال میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا۔ وہ اپنی انفرادی آزادی کا حد سے زیادہ دلدادہ ہوتا ہے۔ مگر مسلمان علاقے تہی دست و تہی مایہ ہیں۔ ان کی زرعی پیداوار ناکافی و ادنیٰ اور صنعتی پیداوار ناقابلِ لحاظ ہے۔ ان ملکوں میں صنعتی مزدوروں کا طبقہ نہیں ہے جن سے مارکس بغاوت اور انقلاب کی اُمیدیں باندھے ہوئے تھا۔ لیکن یہاں کثیر تعداد میں کسان ہیں۔ ان لوگوں میں زرعی ترقی اور مزارعین کے لئے ابتدائی حق اور انصاف کی ضرورت ہے۔ اگر پُرامن طریقوں سے ان کو حقوق مل جائیں تو یہ اس کو زیادہ پسند کرینگے۔ اگر صلح و آشتی کے ذرائع مفید و کارآمد نہ ہوں اور برسرِ اقتدار منفعت پیشہ زمینداروں نے قوانین کے نفاذ میں ایثار و حق پسندی سے کام نہ لیا۔ تو فاقہ زدگی کی بے پناہ قوت ان مفلوک الحالوں کو بے جگری اور تشدد پر آمادہ کر دیگی۔ انہیں اس امر کا ایقان ہے کہ اگر اسلام کو صحیح طریقہ پر سمجھا جائے اور عمل کیا جائے تو وہ ان کی خاطر خواہ دستگیری کر سکتا ہے اور اسی خیال کے تحت وہ معاشی عدل کے لئے اپنی دادخواہی میں اسلام ہی سے دادخواہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اسلام کی قدامت پرست اور رجعت پسند تفسیر ان کی راہ میں مزاحم ہوگی تو وہ مذہب ہی سے

بدظن ہو کر اسے خیرباد کہہ دینگے۔

روسی تجربہ یا چینی تجربہ نے اگر مفلوک الحال کسانوں کو بہتر مواقع عطا کئے ہیں تو انہیں حاصل کرنے کے لئے اسلام مسلمانوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ اگر مسلمان سائنسی اور صنعتی طریقے ان لوگوں سے سیکھتے ہیں جنہوں نے صبر آزما تحقیقات اور آزمائش و خطا کے طریقہ سے انہیں ترقی دی ہے، اور تدریجاً ایک عام آدمی کی حالت کو سدھارا ہے تو ان کی زرعی تنظیم بھی منفعت پیشگی کے بجائے امداد باہمی کے اصول پر کیوں نہ ہو؟

اسلام ایک جمہوریت پسند مذہب ہے، لیکن روحانی کمال کی طرح جمہوریت بھی ایک مثالی چیز ہے۔ یہ جو شکل اختیار کرتی ہے وہ عہد بہ عہد بدلتی رہتی ہے اور حالات، طبائع اور قوموں کے تدریجی پس منظر کے مطابق جو اس کی تشکیل قوانین و ادارات میں کرتے ہیں، اس میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ابتدا میں اسلام نے اس سمت میں بڑی اولوالعزمانہ پیش قدمی کی اور وہ سب کچھ کر دکھایا جس کی اس وقت کے حالات نے اجازت دی۔ اس نے بہت سے ایسے نظامات کو برداشت کیا جو نظریاتی لحاظ سے اس کی روح کے منافی تھے، لیکن جو کسی فرمان کے ذریعہ مٹائے نہیں جا سکتے تھے۔ مثال کے طور پر کوئی قدیم اخلاقی اصول یا مسلک بالکلیہ غلامی کا استیصال نہ کر سکا، کیونکہ معیشت کی تمام تر عمارت اسی بنیاد پر استوار تھی۔ اسلام نے غلاموں کی حالت بہتر بنائی اور حسن سلوک کے لئے قوانین کا نفاذ کیا۔ غلاموں کو آزاد کرانے کی تلقین ایک زبردست مستحسن فعل کی طرح کی گئی اور حکومت کی طرف سے اس کام پر روپیہ خرچ کیا جانا ضروری قرار دیا۔ چنانچہ یہ کہنا بالکل نازیبا ہوگا کہ اسلام جمہوریت پسند نہیں تھا، کیونکہ اس نے غلامی کو روا رکھا اور بیک جنبش قلم اس کا انسداد نہیں کیا۔ اسلام کے معنی چند تصوری رجحانات کے ہیں جن کے مطابق انسانیت دائماً ترقی کرتی رہتی ہے۔ اسلام کے زبردست فلسفی شاعر اقبال کے الفاظ میں یہ تکمیل سے زیادہ تمنا کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس نے خود کو نظامات و آئین میں متشکل کیا، مگر یہ اس کی عارضی صورتیں ہیں۔ جب ترقی کناں زندگی اجازت دیتی ہے تو یہ جدید نظامات و ادارات میں صورت پذیر ہو سکتا ہے۔ اسلام کے ظہور کے وقت حق ملکیت زمین کے جو نظامات رائج تھے ان کی اصلاح عدل معاشری کے مفاد کی خاطر کی گئی۔ ان میں سے گو بعض کو روا رکھا گیا مگر ان کو بطور معیار کے تصوّر نہیں کیا گیا۔ آبادی میں روز افزوں اضافہ اور اراضیات پر کثیر ہجوم کے سبب بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ یہ کام جزوی اصلاح سے نہیں ہو سکتا بلکہ پورے سانچوں کو سختی کے ساتھ بدلنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر مشینی آلات کے ذریعہ زراعت اس صدی سے قبل کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی اور قطع نظر دیگر وجوہات کے یہ ترقی بجائے خود مشترکہ طور پر زراعت بر پیمانۂ کبیر کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

جب یہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو جائے کہ مسلمانوں کو اپنی موجودہ پس ماندگی میں ترقی یافتہ مغربی ممالک سے بہت کچھ سیکھنا ہے، تو ساتھ ہی واضح طور پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ انہیں اپنے نظریات میں کسی ہدایت اور رہبری

کی حاجت نہیں ہے۔ انہیں خدا کی بابت اپنے تصوّر یا خدا اور انسان کے تعلق، یا انسان اور کائنات کی باہمی نسبت کو ترقی دینے کے لئے مغرب کی طرف رُخ کرنا نہیں ہے۔ ایسے ہی انہیں اخلاقیات کے کوئی جدید اصول سیکھنے کی اور نہ مغرب سے جمہوریت کے اساسی اصول حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو یہ اصول سیکھنے کی نہیں بلکہ مابقی انسانیت کو سکھانے کی ضرورت ہے، بشرطیکہ پہلے وہ خود اسلام کی اصلی روح اور اس کے اساسی میلات سے ان کو پھر حاصل کریں۔ ان اصولوں کو اصلی جامہ پہنانے میں شاید دوسروں نے ان سے زیادہ بہتر کام انجام دیا ہے۔ اس لئے انہیں مغربی نظامات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی وہ نہ من حیث الکل اختیار کریں اور نہ ان کی کورانہ تقلید کریں۔ انہیں اپنے قومی ذوق اور منشائے اسلام کے مطابق ان میں تصرّف کرنا پڑے گا۔ مغرب میں مختلف نوعیتوں کی جمہوریتیں ہیں۔ برطانوی، فرانسیسی، اسکینڈی نیوی اور سوئیستانی جمہوریتیں سب کی سب اپنے امتیازی اوصاف رکھتی ہیں۔ اگر مسلمان ان میں سے کسی ایک نمونہ کی محض تقلید کرکے ترقی کرنا چاہیں، تو وہ اس کو کامیابی تک نہ پہنچا سکیں گے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ تمام مسلم ممالک جغرافیائی، نسلی اور معاشی اختلافات کے سبب کسی ایک نمونہ کو اختیار نہیں کر سکتے۔ مثلاً خانہ بدوش اقوام کسی مہذّب مملکت کے سکونت پذیر باشندوں کی طرح ایک ہی قسم کی جمہوریت اختیار نہیں کر سکتے۔ عالمِ اسلامی ایک نہایت وسیع دنیا ہے۔ اسلام کے عام تصوّرات ایک ہی ہیں، لیکن ان کی عملی صورت قوم بہ قوم اور ملک بہ ملک بدلتی رہتی ہے۔

اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ قرآن اس کی اسی طرح تعریف کرتا ہے۔ مگر فطرت میکانی طور پر یکساں و یکرنگ نہیں۔ یہ ریاضیاتی طریق پر قابلِ غور مظاہر میں محدود نہیں۔ علاوہ طبیعی فطرت کے فطرت انسانی اور فطرتِ الٰہی بھی اپنا وجود رکھتی ہے یہ کائنات روحانی ہے جو مادیات سے متمائز و مختلف ہے۔ مگر کل کائنات ایک مستقل اور ایسے ہی ایک متبدل پہلو رکھتی ہے۔ نوامیسِ فطرت نت نئے مظاہر سے، جو ان قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں، زیادہ ثابت و راسخ ہوتے ہیں۔ خدا ہمیشہ یکساں و یکرنگ ہے، تاہم اس کا تخلیقی عمل کبھی ایک ہی طرز پر ہمرنگی کے ساتھ کسی فعل کا اعادہ نہیں کرتا۔ جب کوئی وجود اپنے مرتبہ میں ترقی کرتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ مطابقت پذیر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانیت میں منطقی حرکت موجود ہے، جو نہ مادہ پرستانہ ہے اور نہ عقل پرستانہ۔ زندگی تنوع پیدا کرتی ہے۔ اختلاف و اتحاد پہلو بہ پہلو ترقی کرتے ہیں، جس سے زندگی تدریجاً سنورتی ہے۔ انسانی اوارت کو چاہیئے کہ وہ تمام موجودات کی اس بنیادی سرشت کو پیشِ نظر رکھیں اور ثبات و تغیر اور نظم و بے نظمی کے درمیان ہمیشہ ایک جدید توازن قائم رکھیں۔ جبر و اختیار دونوں مساوی طور پر حقیقی ہیں۔ مادہ کاملاً مجبور نہیں اور نہ روح کلیتاً مختار ہے۔

جیسے جیسے زندگی ترقی کرتی ہے، جدید تصوّرات پیدا ہوتے ہیں جو نئے تجربات کی توضیح کرتے ہیں۔ قوانین و آئین کو بدلے ہوئے ماحول کے ساتھ جدید مطابقتوں کے وقت پیہم کوشش سے تشکیل دینا پڑتا ہے۔ اسلامی مفکّر ہر قسم کی

زندگی کو سنوارنے والے تصورات سے بخوبی مالا مال ہے۔ تمام تقلید پرستیاں جنہوں نے معنی سے زیادہ لفظ کی پرستش شروع کر دی اور ہر حالت اور ہر زمانہ میں زندگی کے طور طریقوں کے انضباط کے لئے تفصیلی قوانین وضع کئے وہ ایک ایسے مذہبی شعور کے متحجرات بن گئے جو کبھی زندگی کی برکتوں سے مالا مال تھا۔ ایک فرانسیسی آزاد خیال روحانی نے اذعانی اصول کی بابت بالکل سچ کہا ہے کہ "اذعانی اصول مردوں کا ایک ایسا زندہ مذہب ہے جو زندوں کے لئے ایک مردہ و بے جان مذہب بن چکا ہے"۔

کوئی مذہب زندہ رہنے سے اس وقت باز رہتا ہے جب اس کے تصورات و عادات اور رسوم و رواج ایسے بے لوچ ہو جاتے ہیں کہ تمام جدید تجربات و اختیارات سے خطرناک بدعات کی طرح اجتناب کیا جانے لگتا ہے۔ ہندو مت غیر متبدل ذات پات کی بندشوں کے سبب اپنی زندگی کھو بیٹھا۔ اس میں پیدائش سے موت تک زندگی کے ہر عمل کی کسی قدیم ضابطہ سے توثیق کرنی پڑتی تھی۔ یہودیوں نے اپنی روحانی زندگی اس وقت کھو دی جب یہودیت ظاہر پرستی اور فریسیت ( ) میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو گئی۔ غیر استدلالی عیسائیت کا دور دورہ قرونِ مظلمہ کے ساتھ ہم زمان رہا۔ اگر کوئی راسخ الاعتقادی مخلصانہ ہو تو وہ خدا کی رضاجوئی میں احترام اور طلب صادق سے وابستہ ہوتی ہے۔ مگر خاص موقعوں کے قوانین و احکام کو تمام زمانوں کے لئے ضابطہ کی صورت میں تبدیل کرنے سے وحی کی اصل حیثیت قائم نہیں رہتی، جس میں کہ اس کا نزول ہوا تھا۔ جیسا کہ ولیم ٹمپل نے اپنی تقاریر میں کہا تھا کہ "ایک ہی حکم سزا کے وہ سب مستوجب ہیں جو فریسی اصول کی پیروی میں غیر متبدل قاعدوں کے ذریعے زندگی کا انضباط چاہتے ہیں۔ وحی کا نزول ایک زندہ تجربہ کی صورت میں ہوا ہے اور وہ یہ کہ جو کچھ اس میں دائمی شہادت ہے ان کا بیان عقائد کی شکل میں نہیں کیا جا سکتا"۔ اسلام کے ظہور کے وقت یہودی فریسیوں کے زیر اثر تھے، اور عیسائی ظلمت پسند اور گمراہ کلیسائی اقتدار کے محکوم تھے۔ اسلام انسانی روح کو آزادی دلانے کی ایک تحریک تھی اور یہ اپنی حیرت انگیز کامیابی کے لئے اپنے آزادانہ نقطۂ خیال کا رہین منت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن اور سنت نے مسلمانوں کو معدودے چند قوانین عطا کئے۔ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہے کہ:

دعونی ما ترکتکم انما اھلک من قبلکم کثرۃ سوالھم واختلافھم علیٰ انبیائھم فاذا نھیتکم عن شیٔ فاجتنبوہ واذا امرتکم بامر فاتوا منہ ما استطعتم (متفق علیہ)

مجھ کو چھوڑ دو جب میں تم کو چھوڑ دوں، بے شک اگلی امتوں کو کثرت سوال نے اور انبیاء کی مخالفت نے ہلاک کیا۔ جب تم کو کسی بات سے منع کروں تو اس سے باز رہو اور جس بات کا حکم دوں اس کو کرو، جتنی تم میں استطاعت ہو"۔

اسلام کسی مذہبی پیشوائیت کے قیام یا کسی مذہبی طبقہ کی تشکیل سے اندیشہ مند تھا، اس خوف سے کہ یہ لوگ خدا اور بندہ کے درمیان وسیلہ کے طور پر کام کرنے لگیں گے اور انسانی روح کی آزادی کو دبا دینگے۔ مسلم قوم

میں عیسائی نوعیت کی مذہبی پیشوائیت کے فروغ پانے کا امکان نہیں اور نہ ہندوؤں کی طرح کوئی پروہتی فرقہ وجود میں آسکتا ہے، لیکن مولویوں نے بتدریج فریسیت یا ظاہر پرستی کو ترقی دی اور یہ غیر سرکاری دینی حکومت کا ایک طبقہ بن بیٹھے۔ اگرچہ کہ ان کی کوئی درجہ وار ترتیب نہ تھی، مگر تمام ضروری اور جدید ترقیوں کے خلاف مقاومت کی کافی قوت رکھتے تھے۔ آنحضرتؐ نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ایک زمانہ آئے گا جب مسلمانوں میں بھی غیر استدلالی اندازِ فکر ترقی پا جائے گا، جیسا کہ ظہورِ اسلام کے وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان بھی نجات کی اجارہ داری کے دعویدار بن جائیں گے اور اپنی اخلاقی اور روحانی حیثیت کا لحاظ کئے بغیر خود کو "چہیتی قوم" سمجھنے لگیں گے۔ یہ فریسی نقطہ خیال کی مدح وثنا کرینگے۔ زیادہ زور ظاہری پابندیوں پر دیں گے اور لفظ وصورت کو روح ومعنی پر ترجیح دیتے ہوئے پوست کی حفاظت میں مغز کو برباد کر دینگے۔ تمام روشن خیال مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ واقعتاً یہ چیز رونما ہو چکی ہے اور مسلمان اس وقت اپنے خاص رنگ کی فریسیت کے زیر سایہ، جسے ملائیت کہا جاتا ہے زندگی گذار رہے ہیں۔ اس نے اسلام کی ترقی پذیر روح کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اس وقت 'ملا' ابدی صداقتوں کا حامل اور نگہبان ہونے کا دعویدار ہے۔ وہ ہر اہم مسئلہ کا کسی قدیم ماخذ کی بنا پر ایک تیار حل رکھتا ہے۔ کوئی نیا مفکر ومصلح معتبر نہیں ہوتا۔ کیونکہ آزاد خیالی تمام تقلید پرستوں کے نزدیک مردود قرار دی گئی ہے۔ سیاسی اقتدار اعلیٰ کے معاملہ میں یہ بادشاہت کو جمہوریت پر ترجیح دیتے ہیں اور ایک فاسق وفاجر اور لایعقل بادشاہ کو ظل اللہ کا خطاب دیتے ہیں، جو حقوق ربانی کی بنا پر حکمرانی کرتا ہے۔ یہ حقِ ملکیت زمین کی اصلاح یا امداد باہمی کے اصول پر زرعی ترقی کی طرف ایک قدم بھی بڑھنا نہیں چاہتے۔ یہ بڑی زمینداریوں کی تائید میں نیک نیت اور پُرجوش حامیوں کی طرح کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ غلاموں کو آزادی دلانے اور اس غیر انسانی ادارہ کو برخاست کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اسلامی تعلیم عورت ومرد کے حقوق میں مساوات قائم کرنے کے لئے ہے، مگر مولوی اس امر کی تبلیغ کرتے ہیں کہ عورت پر مرد کی حکومت قائم ہو۔ نکاح وطلاق کی بابت اسلام کے معقول قوانین مرد کے مفاد کی خاطر مسخ کر دئے گئے ہیں۔ اور یہ نہایت جسارت کے ساتھ اس امر کا ادعاء کرتے ہیں کہ تمام ترقی پذیر، آزاد اور مطابقت پذیر قانون سازی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ ایک ہزار سال قبل کے فقہاء، خدا اور اس کے رسولؐ سے زیادہ قابلِ اعتبار اور مستند بن گئے ہیں۔ اس رجعت پسند تقلید پرستی کے اثر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام جامد اور ترقیوں کا مخالف ہو گیا ہے۔

اسلام صرف اسی صورت میں دوبارہ ترقی کر سکتا ہے کہ وہ اپنی دیرینہ وسعتِ نظر کو پھر سے حاصل کرے اور اپنے ابدی اقدار کو دوبارہ پیش کرے۔ مسلمانوں کو فرد کی آزادی اور احترام کا لحاظ کرتے ہوئے خدا پرستانہ جمہوریت کو فروغ دینا ہوگا۔ اصل اسلام ایک انسان کا دوسرے انسان کے ہاتھوں مذہبی، معاشری، سیاسی اور معاشی

استحصال ختم کرنے کی ایک کامیاب کوشش تھا مسلمان اس وقت تک ترقی کرتے رہے جب تک علم و صداقت کی جستجو ان کے نزدیک ایک مذہبی فرض کی شکل میں رہی۔ ذات پات کے نظامات اور طبقات کو ختم کر کے انہوں نے ایک انسانی برادری کی تخلیق کی۔ آزادی ضمیر اور شہری حقوق میں مساوات ان کے ایمان کے بنیادی اصول تھے۔ ان تمام تہذیبی اثرات کو قبول کرنے کے لئے اُمتِ مسلمہ ہمیشہ تیار رہتی جو اسلام کے اساسی اصول کے منافی نہ تھے۔ اسلام کے بڑے بڑے فقہاء آزاد خیال اور وسیع النظر تھے۔ اسلامی تہذیب یونان کی ثقافتی خدمات سے بہت کچھ مستفید ہوئی۔ آنحضرت صلعم نے انہیں یہ تعلیم دی تھی کہ مہد سے لحد تک علم کی جستجو میں لگے رہیں خواہ اس کی تلاش میں انہیں چین کے دور افتادہ ملک تک سیاحت کرنا پڑے۔ مسلمان اب بھی ایسی ہی روش اختیار کر کے ترقی کر سکتے ہیں۔ وہ مغرب کی علمی و فنی ترقیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ مغرب کی اشتراکی تحریکات کے مطالعہ سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اگر اسلام کی اصلی روح کے ساتھ وہ وفادار ہیں تو کامیابی کے ساتھ اشتمالیت کی مبارزت طلبی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اشتمالیت میں ہر چیز ناحق اور ناروا نہیں ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ منفعت پیشگی اور ظلمت پسند کلیسائی اقتدار کے خلاف ایک طرح کی بغاوت تھی۔ یہ قرآن تھا جس نے مارکس سے ایک زمانۂ دراز قبل معاشی عدل و انصاف کی تلقین اس طرح کی تھی کہ:

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْكُمْ ط (اپنی معاشی زندگی کی تنظیم اس طرح کرو کہ) دولت چند مالداروں کے درمیان گھومتی نہ رہے۔ (الحشر - ۷)

جائز حدود کے اندر قانون سازی کی اجازت عطا کر کے اس نے استحصال کی جملہ راہیں مسدود کر دیں۔ زائد از ضرورت دولت قوم کے نادار افراد کی طرف لوٹائی گئی۔ پیغمبر اسلام نے مسلم مملکت کی بناء خیر و فلاحِ عامہ کے اصول پر ڈالی ہے۔ مسلمان اشتمالی معاشی منصوبہ بندی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ روسی اشتمالیت نے اپنے ذاتی اغراض کے حصول کے تحت فرد کے جائز حقوق پر بھی کاملاً قبضہ کر لیا ہے اور یہ چیز بڑی حد تک غیر اسلامی ہے۔ نیز مسلمان مارکسی و لینینی نظریات کی ملحدانہ یا مادہ پرستانہ اساس بھی قبول نہیں کر سکتے۔ روس نے ایک عام آدمی کی فلاح و بہبود کے لئے اور قدرتی ذرائع سے حکمیاتی طریق پر فائدہ اُٹھانے کے بہت سے کام کئے ہیں۔ اور یہ قابلِ تعریف ہے۔ روس کی بابت یہ بالکل سچ کہا گیا ہے کہ جتنی اچھی باتیں اس کے متعلق کہی گئی ہیں وہ بھی درست ہیں، اور جتنی بُری باتیں اس سے منسوب کی گئی ہیں وہ بھی بالکل صحیح ہیں۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ روس کا اثر و نفوذ ایسے ممالک پر بھی ہے جو اشتمالیت کے مخالف ہیں۔ مسلم علاقے بھی اس اثر و نفوذ سے نہیں بچ سکتے۔ اسلام اور جن باتوں کی اس نے حمایت کی ہے ان پر، موثر غور و فکر کے ذریعہ مسلمان کامیابی کے ساتھ اشتمالیت کی مبارزت طلبی کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اشتمالیت ایک قوتِ عمل رکھنے والی تحریک ہے۔ جس میں تمام نادار اور

غیر حق یافتہ طبقات کے لئے بڑی دلکشی ہے۔ ایک رسمی اور غیر متبدل اسلام اس للکار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر مسلمان حکومتیں کمزور و بے اصل رعایات و حقوق برخاست کرنے کے لئے کچھ نہ کریں گی اور ایک عالمی کی مادی اصلاح و ترقی سے بے اعتنائی برتیں گی تو اشتمالیت کی جاذبیت کو کسی طرح کم نہ کیا جا سکے گا۔ اشتراکیت کا بلند تر نمونہ ہی اس مبارزت طلبی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ انسان محض روٹی سے زندہ نہیں رہتا، لیکن ایسے ہی یہ بھی سچ ہے کہ وہ بغیر روٹی کے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ بحالتِ موجودہ ایک غریب آدمی آخرت کے اجر و ثواب کے وعدوں پر مطمئن رہنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس زندگی کی فلاح و بہبود اور نیز آخرت کے لئے دعا مانگا کریں۔ اسلام نے معاشری، سیاسی اور معاشی اصلاح کی کوشش کو صحت بخش اخلاقی و روحانی زندگی کے لئے بطور شرط اوّلیں کے قرار دیا ہے۔ اسلام نے اس امر کو فراموش نہیں کیا کہ انسانی زندگی مادی اساس بھی رکھتی ہے، اس لئے جسمانی ضرورتوں سے بے اعتنائی خود روحانی زندگی کو خطرہ میں ڈالے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ اسلام کے نزدیک زندگی کا تصوّر مثل ایک غیر تقسیم پذیر وجود کے ہے۔ اُخروی روحانیت اور ایسے ہی دنیوی مادیت دونوں انتزاعات اور تجریدات ہیں، جنہیں اگر قائم بالذات وجود تسلیم کیا جائے تو وہ زندگی کو انقراض و زوال کی طرف لے جائے گی۔ زندگی اس عالم میں اس طرح بسر کی جائے کہ ہستی کے روحانی پسِ منظر کی لامتناہیت سے ہر عمل کی تقدیس و تطہیر ہوتی رہے اور زندگی مثل ایک سالم کل اور بحیثیت ایک عظیم تنوع رکھنے والی روحانی وحدت کے فروغ پائے۔ مذہبی تصوّرات و ادارات جب نئے ماحول کے حقائق سے بے تعلقی برتتے ہیں تو زندگی کو سنوارنے والی قوتوں سے تہی دامن ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی مادی زندگی روحانی اساس سے بے تعلق ہو کر اپنی آپ تردید کرتی اور جامد ہو جاتی ہے جس کا سبب ذات واجب الوجود سے انقطاع و مہجوری ہے۔

مسلمانوں کی زندگی کی اصلاح و تعمیر اپنی تمام شکلوں میں مذہب کے اس وسیع نقطہ خیال پر کرنی چاہیئے جس کو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ مذہب و مملکت اور دنیادار اور دیندار کی تقسیمیں مغرب کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کے تقاضوں سے بطور نتیجہ کے پیدا ہوئی ہیں۔ کوئی مسلمان جو اسلام کے منشاء سے آگہی رکھتا ہو وہ نسل انسانی کی مختلف خانوں میں تقسیم کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہر ایک فرد کے لئے مذہب کو بطور معیارِ عمل کے ہونا چاہیئے، تاکہ وہ اپنی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو تا حدِ امکان درجۂ کمال تک پہنچا سکے۔ اس کا فرض منصبی ہے کہ خالق و مخلوق اور انسان اور اینائے جنس کے باہمی ربط و تعلق کو ہم آہنگ و برقرار رکھے۔ اس کے علاوہ دنیا کے متعلق ایک صحیح اندازِ فکر عطا کرے۔ انسان رجعت پسند مذہبی اقتدار سے تنگ آگیا اور جب روحانی اجارہ داروں کا ایک طبقہ انسان کی شخصی خصوصیتوں کی آزادانہ نشوونما میں حارج ہوا، تو عوام ایک دوسری انتہا لادینی کی طرف جھک پڑے، جو مادہ پرستانہ عقلیت کے ساتھ ہم رنگ ہو گئی تھی۔ جب مذہب نے زندگی کی راہ روکنی شروع کی تو سیاسیات کو

ایسے تنگ نظر مذہب سے کنارہ کش ہو جانا پڑا۔ ذہنی آزادی کو بھی مذہبی معتقدات اور فقہیات سے علٰحدہ ہو کر حاصل کرنا تھا۔ تاریخ کی منطقی حرکت میں یہ تضاد پیدا ہونا ہی تھا جو کہ بجائے خود قائم نہیں رہتا بلکہ ایک نئے نظریہ کی طرف گریز کرتا ہے۔ اگر انسان ان رشتوں کو قطع کر دے جن کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا ہے، تو مقطوعہ اجزاء پژمردہ ہونے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جوابی دعویٰ بھی باوجود اپنے یک رخے پن کے چند کارآمد اقدار کو فروغ دیتا ہے۔ زندگی کو ہر قدم پر کچھ نہ کچھ تردید کرنی پڑتی ہے، تاکہ ایک بیش قدر و لطیف تر تصدیق کی طرف پیش قدمی کر سکے۔ مغرب کی حکیماتی اور معاشی مادہ پرستی نے زندگی کی چند ایسی شکلوں کو فروغ دیا ہے جن کی نشو و نما مذہبی تقلید پرستیوں اور مولویوں کے مستقل مفادات کے حدود میں رہ کر نہیں ہو سکتی۔ جب مسلمانوں کی ترقی موقوف ہو گئی تو ان کی قوتِ عمل مغربی اقوام میں منتقل ہو گئی۔ مغرب کی عملی سرگرمیوں کی تین صدیوں کے دوران میں تمام عالمِ اسلامی بے حس و حرکت اور غفلت کی نیند سوتا رہا۔ بیسویں صدی ایک عام بیداری کی صدی تھی۔ دو عالمگیر جنگوں نے، جو مادہ پرستانہ ترقی کا ناگزیر نتیجہ تھیں، تمام اجتماعی اور نظریاتی ڈھانچوں کو ہلا دیا۔ ہر جگہ انسان اپنے مسلمہ اقدار کو دوبارہ جانچنے پر مجبور ہوا۔ ایسے علاقوں میں بھی جہاں اس انقلابی اکھاڑ پچھاڑ کا راست اثر نہیں پڑا تھا، بالواسطہ ذہنی انقلاب رونما ہوا اور جدید تصوّرات، جملہ ادارات کی از سرِ نو تشکیل کرنے لگے۔ ہر جگہ ایک ہل چل مچی ہوئی ہے۔ قدیم خیالات اور مستحکم مستقل مفادات ایک طرح کی پسپائی جنگ لڑ رہے ہیں۔ سائنس اور صنعتی علوم نے بُعد و مسافت کا خاتمہ کر کے تمام دنیا کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے۔ اس وقت کوئی قوم دوسروں سے جُدا رہ کر سیاسی، معاشی یا ذہنی علٰحدگی اختیار نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی قوت دنیا کے کسی خطہ میں برسرِ عمل ہو تو اس کی صدائے بازگشت سے سارا عالم گونج اُٹھتا ہے۔ پوری دنیا اس وقت ایک عضویت بن چکی ہے، اگرچہ عالم گیر اتحاد ابھی تک محض خواب و خیال اور ایک موہوم و دور دراز منزل مقصود ہے۔ عالمِ اسلامی کے لئے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ وحدتِ انسانیت کے حصول میں اپنی اہم خدمت انجام دے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان ایک مرکزی منطقہ پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ مشرق و مغرب دونوں سے وابستہ ہیں۔ قرآن نے انہیں اُمتِ وسطیٰ کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ اسلام جغرافی اور تہذیبی حیثیت سے ایسا ہی تھا۔ بیدار و باخبر اسلام اب پھر وہی کام انجام دے سکتا ہے۔ مسلمان اسلام کے تکمیلی منشاء کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک عظیم الشان امتزاج حاصل کرنے کے بہترین موقف میں ہیں۔ ابھی مسلمانوں کو جمود و بے حسی پر غلبہ پانا ہے۔ بہت کچھ علوم و فنون حاصل کرنا ہے۔ اور مغربی شہنشاہیت کی باقی ماندہ یادگاروں سے سیاسی آزادی کی لڑائیاں لڑنی ہیں۔ صدیوں کے جمود کو توڑنے کے لئے متعدد داخلی ہنگاموں کی ضرورت ہے۔ خود اسلام کے مفاد کی خاطر انہیں اپنی تقلید پسندی کو تمام غیر اسلامی اضافوں سے پاک کرنا ہے۔ دائمی اقدار اور ابدی صداقتوں کو بہت سی ایسی ریاکاریوں اور نقالیوں سے پاک صاف کرنا ہے

جنہوں نے مذہب کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ اسلام کو اب بھی خدا کی پرستش کی اساس پر انسان کو متحد کرنے کا فرض انجام دینا ہے۔ عالمِ اسلامی ملحدانہ اور شدید مادہ پرست قوتوں کے خلاف ایک بہترین پناہ گاہ بن سکتا ہے۔ ایک عالم گیر مسلم برادری کی بنا ڈالنے کے علاوہ قرآن نے تمام خدا پرستوں کی ایک وسیع برادری پر بھی غور کیا ہے۔ اسلام کے ایک زبردست فلسفی اور مبصر اقبال نے اپنے خطبات "اسلام میں مذہبی افکار کی تشکیل جدید" میں یہ کہا ہے کہ "عہدِ حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی حیثیت کا بخوبی اندازہ کرے۔ اساسی اصول کی روشنی میں اپنی معاشری زندگی کی اصلاح کرے اور اسلام کے اس وقت تک منکشف شدہ مقاصد سے یہ استنباط کرے کہ روحانی جمہوریت کا قیام اسلام کا آخری نصب العین ہے۔"

فکرِ اقبال

(مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)

یہ بلند پایہ تصنیف اقبالیات میں گراں قدر اضافہ ہے جس میں حضرت علامہ اقبالؒ کی شاعری اور فلسفہ کے ہر پہلو کی دل نشیں اور حکیمانہ انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ قیمت دس روپے۔

افکارِ غالب

(مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)

اُردو ادب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس میں غالبؔ کے ان فارسی اور اُردو اشعار کی شرح کی گئی ہو جو بلند پایہ فلسفیانہ اور حکیمانہ مطالب کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے "افکارِ غالب" میں غالبؔ کے فلسفیانہ کلام کی حکیمانہ تشریح کر کے اُردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ قیمت آٹھ روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ

منیجر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور